20

(1) غرباء کے لئے غلّہ کا انتظام

(2) دودھ اور گھی کا انتظام

(3) احمدی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی تحریک

(فرمودہ 3 جولائی 1942ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

(1)

"آج مَیں خطبہ میں تین متفرق امور کے متعلق باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو مَیں اس غلّے کے انتظام کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو قادیان کے غرباء میں تقسیم کرنے کے لئے جمع کیا گیا ہے۔ مَیں نے پہلے اس تحریک کو بغیر اندازہ کے کہ کس قدر لوگ یہاں امداد کے مستحق ہیں اور ان کے لئے کس قدر غلّہ کی ضرورت ہو گی، شروع کیا تھا اور اپنے ذہن میں پانچ سَو من غلّہ کا اندازہ لگایا تھا۔ اگر میرے ہی اندازہ کے مطابق غلّہ جمع ہوتا یا اس غلّہ کے لئے رقم آتی تو ہم نصف کے قریب آدمیوں کو بھی غلّہ نہ دے سکتے لیکن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا طریق ہمیشہ ہمارے ساتھ چلا آتا ہے اس نے جماعت کے دوستوں کو توفیق عطا فرمائی کہ وہ کثرت سے اس میں حصہ لیں۔ چنانچہ قریباً بارہ سَو من غلّے کا اندازہ ہے جس کی وصولی کی امید کی جاتی ہے اور ہمارا موجودہ اندازہ جو قادیان میں تقسیم کے متعلق ہے وہ بھی گیارہ بارہ سَو من

کے قریب ہے۔ دو تین سَو من اتفاقی ضرورتوں کے لئے بھی جمع رکھنا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ ابھی باہر سے آہستہ آہستہ وعدے آرہے ہیں اور لوگوں کی طرف سے رقوم بھی پہنچ رہی ہیں اس لئے یہ کوئی بعید بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہماری یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے مگر اس بارے میں مَیں ان کو جنہیں غلّہ دیا گیا ہے نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے ان کے لئے پانچ پانچ مہینے کے غلّے کا انتظام کر دیا ہے۔ گویا جو غلّہ انہیں اس وقت دیا گیا ہے یہ آئندہ دسمبر، جنوری، فروری، مارچ اور اپریل کے لئے ہے۔ مئی میں چونکہ نئی فصل شروع ہو جاتی ہے اس لئے مئی کے لئے کسی انتظام کی ضرورت نہیں۔ ہم غلّہ کی اتنی مقدار اپنے پاس جمع نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں بہت سے غلّہ کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا اس لئے وہ غلّہ ہم نے آج ہی تقسیم کر دیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سب کو تقسیم کر دیا گیا ہے بلکہ تقسیم کرنا شروع کر دیا گیا ہے کیونکہ ابھی تک پورا غلّہ نہ ملنے کی وجہ سے سب کو غلّہ نہیں پہنچایا جا سکا۔ اس وقت تک ہم ساڑھے چھ سَو من گندم خرید سکے ہیں اور اس میں سے پونے پانچ سَو یا پانچ سَو من کے قریب تقسیم بھی کر چکے ہیں اور ہمارا ارادہ یہ ہے کہ جوں جوں غلّہ آتا جائے گا اسے فوراً تقسیم کرتے چلے جائیں گے۔ پس ایک تو وہ دوست جنہیں ابھی غلّہ نہیں پہنچا گھبرائیں نہیں۔ بعض لوگ مجھے رقعے لکھتے رہتے ہیں کہ باقیوں کو تو غلّہ مل گیا ہے مگر ہمیں نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمیں غلّہ ابھی تک ملا نہیں۔ ہمارے پاس اس وقت سات آٹھ سَو من غلّہ خریدنے کے لئے روپیہ موجود ہے مگر غلّہ ملتا ہی نہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ارد گرد کے دیہات سے غلّہ جمع کریں اور اگر اِرد گرد کے دیہات سے غلّہ نہ ملا تو خواہ ہمیں گراں ہی خریدنا پڑا بٹالہ یا امرت سر سے خرید کر لایا جائے گا۔ پس جن لوگوں کے لئے غلّہ کی منظوری ہو چکی ہے وہ تسلی رکھیں۔ جوں جوں غلّہ آتا جائے گا اِنْشَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی ان کے گھروں میں پہنچتا جائے گا۔ ہماری کوشش یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اچھا غلّہ ملے۔ مَیں خود نمونہ دیکھ کر اسے پاس کرتا ہوں اور حتّی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ کنگنی[1] نہ ہو اور نہ گندم میں کوئی اَور نقص ہو چنانچہ خدا تعالیٰ کے فضل سے جن لوگوں نے خود دیکھ کر اور روپیہ دے کر اپنے گھروں کے لئے گندم خریدی ہے ہماری خریدی ہوئی گندم ان کے برابر بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بھی

اچھی ہے۔

دوسری بات مَیں نصیحت کے طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کو ہم نے غلّہ دیا ہے۔ وہ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس سال کے آخری مہینوں کے لئے محفوظ رکھیں۔ میرے پاس رپورٹیں پہنچی ہیں کہ بعض لوگوں نے ابھی سے اس غلّے کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے حالانکہ ابھی مارکیٹ میں غلّہ ملتا ہے اگر ابھی سے اس غلّہ کو استعمال کر کے خرچ کر لیا گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ جب غلّہ کی کمی کا خطرہ ہو گا اس وقت وہ غلّہ کھا چکے ہوں گے اور چونکہ ان ایام کے لئے سلسلہ اپنی ذمہ داری کو پورا کر چکا ہو گا۔ اس لئے ان کو دوبارہ مدد نہیں مل سکے گی۔ پس جہاں جماعت کے آسودہ حال لوگوں نے اپنی ذمہ داری کو سمجھا اور اسے پورا کرنے کی کوشش کی ہے وہاں انہیں بھی اپنی ذمہ داری کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ انہیں خیال کرنا چاہئے کہ اگر انہیں غلّہ نہ ملتا تو لازماً وہ مارکیٹ سے خریدتے۔ پھر جبکہ ان کی ضرورتوں کے لئے غلّہ محفوظ ہو گیا ہے تو وہ کیوں انہی ایام میں اسے استعمال کر رہے ہیں جبکہ غلّہ منڈی میں مل سکتا ہے۔ اگر وہ اسی طرح کرتے رہے تو آنے والے خطرناک ایام میں وہ تکلیف اٹھائیں گے اور سلسلہ ان کی مدد کرنے سے قاصر ہو گا اور وہ تکلیف خود ان کے ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی ہو گی۔

مَیں اردگرد کے دیہات کے لوگوں کو بھی توجہ دلاتا ہوں کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ثواب کا موقع پیدا کر دیا ہے۔ وہ اچھی گندم تلاش کر کے ہمیں اطلاع دیں تاکہ ہم خرید سکیں۔ ہمیں اس وقت ایک ہزار مَن گندم کی ضرورت ہے۔ ہمارے اردگرد جو دیہات ہیں ان میں سے سری گوبند پور میں ہماری جماعت ہے۔ ماڑی بچیاں میں ہماری جماعت ہے۔ جاگو وال میں ہماری جماعت ہے، پھیرو چیچی میں ہماری جماعت ہے۔ اسی طرح عالمہ اور بھینی میں ہماری جماعت ہے، یہ سب جماعتیں مل کر اگر کوشش کریں تو آسانی کے ساتھ ہمیں گندم میسر آ سکتی ہے۔ اسی طرح گورداسپور کی طرف کا جو علاقہ ہے۔ اس میں بھی کافی غلّہ مل سکتا ہے اور زمینداروں کے پاس ابھی تک کافی غلّہ موجود ہے۔ وہ صرف اس امید پر اس کو روکے ہوئے ہیں کہ شاید گندم کی قیمت اَور بھی بڑھ جائے۔ مگر اب گندم کی قیمت اس قدر بڑھ گئی ہے

کہ گورنمنٹ نے جو انتہائی قیمت مقرر کر رکھی تھی اس حد کو پہنچ گئی ہے اور اس سے زیادہ قیمت بڑھنے کا سرِ دست امکان نہیں۔ اس لئے اب زمیندار آہستہ آہستہ غلّہ نکال رہے ہیں کیونکہ قیمت اَور زیادہ بڑھ سکنے کی امید نہیں کر سکتے۔ پس غلّہ ملنے میں دقّت نہیں۔ دقّت صرف یہ ہے کہ غلّہ پھیلا ہوا ہے اور ہمیں علم نہیں کہ کہاں کہاں ہے۔ ہمارے دوست اگر ارد گرد کے دیہات میں پھر کر ہمیں اطلاع دیں کہ فلاں فلاں جگہ گندم مل سکتی ہے تو اس طرح وہ بہت کچھ ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی اطلاع پر ہمارے کارکن وہاں جا کر نمونہ لے آئیں گے اور پسند آنے پر گندم خرید لی جائے گی اگر ایک مہینے تک غلّہ جمع نہ ہوا تو مجبوراً ہمیں باہر کی منڈیوں سے غلہ لانا پڑے گا اور وہ گراں بھی ہو گا اور کچھ جو لوگ زیادہ صبر نہیں کر سکتے۔ ان میں بے چینی بھی پیدا ہو گی اور وہ سمجھیں گے کہ شاید ہمارے حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مَیں بیرونی جماعتوں کو بھی توجہ دلاتا ہوں کہ جن جن جماعتوں نے ابھی تک اس تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ وہ اس طرف جلد توجہ کریں تا کہ وہ ثواب سے محروم نہ رہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہماری جماعت کو ایک ایسا نمونہ پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ جس کی مثال سارے ہندوستان میں نہیں مل سکتی اور کہیں نظر نہیں آتا کہ ضرورت کے موقع پر کسی قوم نے اپنے غریب بھائیوں کے لئے ایسے ایثار اور قربانی سے کام لیا ہو۔ میرے نزدیک اگر وہ دوست جنہوں نے ابھی تک اس تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ اس طرف توجہ کریں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے پندرہ سو من غلّہ کے قریب اکٹھا ہو سکتا ہے اور اس کی قیمت موجودہ نرخ کے مطابق آٹھ ہزار روپیہ ہے۔ اس وقت تک جو اندازہ وعدوں اور غلّے وغیرہ کا ہے وہ ساڑھے چھ بلکہ سات ہزار روپیہ کے قریب ہے۔ اگر ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کے قریب اور وعدے آجائیں تو پندرہ سَو مَن غلّہ یا آٹھ ہزار روپیہ اکٹھا ہو جائے گا۔

دشمن احمدیہ جماعت پر ہمیشہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نے آکر کیا کام کیا اگر وہ اسی قسم کے کاموں کو دیکھیں تو انہیں اپنے اعتراض کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں مگر کہیں بھی یہ مثال نہیں ملتی کہ اس طرح انہوں نے غریب لوگوں کے لئے غلہ جمع کیا ہو بلکہ

سارے ہندوستان میں ہی نہیں، انجمنوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ساری دنیا میں بھی کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی۔ گورنمنٹیں بے شک ایسا انتظام کرتی ہیں مگر وہ ٹیکس لگا دیتی ہیں اور جتنا چاہتی ہیں زبردستی ٹیکس وصول کر لیتی ہیں مگر یہاں کسی پر جبر نہیں کیا جاتا بلکہ لوگ اپنی خوشی سے چندہ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری جماعت نے جو نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ ایک نہایت ہی قابلِ تعریف فعل ہے۔

(2)

دوسرا امر جس کی طرف میں قادیان کے دوستوں کو خصوصاً توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ غلّہ کے سوا بعض اَور چیزیں بھی ایسی ہیں جن کے حصول میں مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اور ان کی طرف بھی ہماری جماعت کو توجہ کرنی چاہئے مثلاً چند ایام سے گھی اور دودھ کی سخت تکلیف محسوس کی جا رہی ہے اور مدارس کے طالب علموں نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ انہیں دودھ ٹھیک نہیں ملتا۔ ان کی شکایت تو اپنے افسروں کے متعلق ہے مگر بات یہ ہے کہ دوسروں کو بھی دودھ نہیں مل رہا اور جو لوگ اپنے پاس روپیہ رکھتے ہیں ان کو بھی مشکل پیش آ رہی ہے۔ اسی طرح گھی کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اَور بھی بڑھ جائے۔ اس لئے مَیں قادیان کے دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ جن کے لئے ممکن ہو اگر وہ گائیں یا بھینسیں رکھ لیں تو آئندہ آنے والے سخت ایام میں نہ صرف ان کو بلکہ ان کے بچوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کو خالص دودھ اور گھی میسر آ سکے گا۔ دودھ پلانے والی ماؤں کا تو انحصار ہی دودھ پر ہوتا ہے کیونکہ دوسرے لوگ تو پھر بھی دودھ پینا چھوڑ سکتے ہیں لیکن اگر دودھ پلانے والی مائیں دودھ پینا چھوڑ دیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آئندہ نسل کو کمزور کر دیا جائے۔ اسی طرح بچوں کو دودھ دینا ضروری ہوتا ہے اور ان کو دودھ نہ دینے کے معنی بھی یہی ہیں کہ ان کو کمزور کر دیا جائے۔ پس اگر صاحب توفیق لوگ گائیں یا بھینسیں رکھنے لگ جائیں تو اس کے نتیجہ میں نہ صرف خالص دودھ اور گھی انہیں میسر آ سکے گا بلکہ جو لوگ بھینسیں نہیں رکھ سکتے۔ انہیں نسبتاً آسانی سے بازار سے دودھ مل جائے گا کیونکہ چیزوں کے ریٹ ہمیشہ اس طرح بڑھتے ہیں کہ جو

لوگ زیادہ مالدار ہوتے ہیں جب انہیں تکلیف محسوس ہوتی ہے تو وہ بھاؤ بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً دودھ کا بھاؤ آٹھ سیر ہو اور کسی امیر کو اس بھاؤ دودھ ملنے میں ذرا بھی دقّت ہو تو وہ کہہ دے گا اچھا مجھے سات سیر ہی دے دو۔ دوسرا کہے گا سات سیر نہیں دیتے تو چھ سیر ہی دے دو تو باوجود اس بات کے کہ اگر وہ صبر کریں اور اپنے نفس کو تکلیف برداشت کرنے کی عادت ڈالیں تو انہیں بھی سستی چیز مل سکتی ہے۔ محض اس وجہ سے کہ ان کے پاس روپیہ ہوتا ہے وہ صبر نہیں کر سکتے اور اس طرح بازار کا بھاؤ بگاڑ دیتے ہیں ہماری لاہور کی جماعت کے ایک نہایت ہی مخلص دوست تھے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بڑے شیدائی تھے۔ شروع شروع میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ ان کے ذریعہ اپنے سودے منگوایا کرتے تھے۔ گو آخر میں حکیم محمد حسین صاحب قریشی جو مفرح عنبری کے موجد تھے ان کے سپرد یہ خدمت ہو گئی تھی۔ وہ دوست نہایت مخلص اور اچھے عہدہ پر تھے۔ جب بھی قادیان آتے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے لئے ضرور کوئی تحفہ لاتے مگر لاہور کے دوست ہنسا کرتے تھے کہ اُن کی عادت ہے کہ دکاندار کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں سیب کس طرح دیتے ہو؟ وہ اگر کہتا ہے عام سیب تو روپیہ کے بیس ہیں مگر اچھے سیب روپیہ کے سولہ ہیں تو یہ جھٹ کہہ دیتے ہیں کہ مَیں نے سیب حضرت صاحب کے لئے لے جانے ہیں تم روپے کے مجھے بارہ سیب دو مگر اچھے دو۔ اس پر وہ وہی سیب جو روپے کے بیس یا سولہ بکتے ہیں دے دیتا ہے۔

غرض صرف ریٹ کے بڑھانے سے چیز اچھی نہیں ملتی بلکہ غور اور فکر اور تلاش سے اچھی چیز ملا کرتی ہے مگر جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے جن کے پاس روپیہ ہوتا ہے وہ ایسے موقع پر جلد بازی سے کام لے کر ریٹ بڑھا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دس پندرہ یا بیس آدمی جو مالدار ہوتے ہیں اور جو در حقیقت ریٹ کو بڑھانے کا موجب بنتے ہیں۔ وہ تو خریدتے رہتے ہیں مگر غریبوں پر مصیبت آ جاتی ہے کیونکہ ان کے لئے بھی ریٹ بڑھ جاتے ہیں اور ان میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اس ریٹ پر چیز خرید سکیں۔

پھر اس کا اثر دکانداروں پر بھی پڑتا ہے جب گاہک زیادہ ہوں تو دکاندار زیادہ مال خریدتا ہے جو اسے سستا پڑتا ہے مگر جب گاہک کم ہو جائیں تو مال زیادہ خرید نہیں سکتا اور جو

خرید تا ہے وہ گراں خرید تا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیزوں میں ملونی شروع ہو جاتی ہے۔ دودھ ہو تو اس میں پانی مِلا دیتے ہیں اور ایسی ایسی تدبیریں کرتے ہیں کہ ان کا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے مثلاً دودھ کی شناخت کا ایک آلہ نکلا ہوا ہے۔ جو سیّال چیز کا وزن بتا دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے معلوم کر لیا گیا ہے کہ خالص دودھ کا اتنا وزن ہے اور پانی کا اتنا۔ پس اس کے ذریعہ سے اگر دودھ میں پانی ملا ہو تو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فرض کرو۔ خالص دودھ کا وزن دس ڈگری ہے اور پانی کا وزن پندرہ ڈگری اور دودھ میں آلہ ڈال کر دیکھا جاتا ہے اور اس کا وزن ساڑھے بارہ ڈگری معلوم ہوتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آدھا دودھ ہے اور آدھا پانی۔

ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام کے زمانہ میں بعض دوستوں نے بڑے جوش سے یہ انتظام کیا کہ قادیان میں جو دودھ فروخت ہونے کے لئے آئے۔ اس کا پہلے آلہ سے ٹیسٹ کیا جائے کہ وہ خالص ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں ایک تو عام لوگوں نے یہ قانون بنایا ہوا ہے کہ دودھ میں برکت نہیں ہوتی۔ جب تک دودھ دیتے وقت برتن میں کچھ پانی نہ ڈال لیا جائے پھر اس برکت کو بڑھانے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اَور زیادہ پانی ملا لیا جاتا ہے۔ ہمارے نانا جان صاحب مرحوم بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اس انتظام کا شوق تھا چنانچہ دودھ ٹیسٹ کرنے کا آلہ خریدا گیا اور اس کے مطابق دودھ کو دیکھا جانے لگا۔ باہر سے جو شخص دودھ لے کر آتا، اسے بٹھا لیا جاتا کہ پہلے دودھ کا امتحان کرا لو پھر بیچنے دیا جائے گا۔ چند دن تو اس کا فائدہ ہوا مگر آخر جہاں پکڑنے والے موجود ہوتے ہیں وہاں تدبیریں نکالنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر عقل کا مادہ رکھ دیا ہے جس کے ذریعہ وہ اگر ایک طرف نیکی میں ترقی کر جاتا ہے تو دوسری طرف چوری اور ڈاکہ وغیرہ کے بھی نئے سے نئے طریق نکال لیتا ہے۔ ننگل گاؤں کا ایک شخص بھی دودھ لاتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ میرا دودھ بڑا خالص ہے۔ آلے سے دیکھا جاتا تو وہ بھی اس کے خالص ہونے کی تصدیق کرتا۔ پانچ سات دن تو اس کی خوب شہرت ہوئی مگر ایک دن کسی کو دودھ جو دینے لگا تو گڈوی میں سے مچھلی نکل آئی۔ اس وقت یہ راز کھلا کہ وہ دودھ میں چھپڑ کا پانی ملا کر لایا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ عام پانی تو ہلکا ہوتا ہے۔ چھپڑ کا گندا پانی اگر میں ڈالوں تو اس کا پتہ نہیں لگے گا۔ چنانچہ وہ

رستہ میں سے چھپڑ کا پانی ملا کر لے آتا مگر ایک دن پانی کے ساتھ مچھلی بھی آگئی اور دودھ ڈالنے لگا تو وہ نکل آئی جس سے اس کا راز کھل گیا۔

غرض یہ نقائص درحقیقت اسی طرح دور ہو سکتے ہیں کہ خود گھر میں گائیں بھینسیں رکھی جائیں۔ اگر قادیان میں سو یا دو سَو گھر ایسے نکل آئیں جو بھینس رکھ لیں تو انہیں بھی دودھ کی سہولت ہو جائے گی اور ان کی وجہ سے باقیوں کو بھی آسانی سے دودھ میسر آنے لگ جائے گا۔ صدر انجمن احمدیہ کے جو کارکن ہیں۔ انہیں پراویڈنٹ فنڈ سے قرضہ دلا دیا جائے گا اور اگر ان کا پراویڈنٹ فنڈ نہ ہوا تو ضمانت پر انجمن سے قرضہ دلا دیا جائے گا اور دس بارہ مہینوں کے اندر اندر واپس لے لیا جائے گا۔ اس طرح دودھ کی دِقّت اِنْشَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی دور ہو جائے گی۔

اسی طرح چارے وغیرہ کے متعلق انتظام کرنا چاہئے تا کہ چارے کی دِقّت بھی محسوس نہ ہو مثلاً میرے نزدیک اگر بورڈنگ والے ہوشیاری سے کام لیں تو سکول کی گراؤنڈز میں ہی کافی چارہ بویا جا سکتا ہے مگر بالعموم دیکھا گیا ہے کہ انتظام ٹھیک ہو تبھی چیز سستی ملتی ہے ورنہ انتظام کی خرابی کی وجہ سے گراں ہو جاتی ہے۔ پس ضرورت ہے کہ اس طرح محنت سے کام کیا جائے جیسے زمیندار کرتے ہیں جس طرح وہ اپنی بھینسوں کی حفاظت کرتے اور چارہ اور دودھ کو ضائع نہیں کرتے اسی طرح ہمارے دوستوں کو کام کرنا چاہئے۔ اگر اس طرح کام کیا جائے تو بورڈنگ کے لڑکوں کو اچھا دودھ مل سکتا ہے اور ان کی صحتیں بھی درست رہ سکتی ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں آٹھ دس گھماؤں زمین ایسی نکل سکتی ہے جس میں چارہ بویا جا سکتا ہے اور چھ سات بھینسیں ایسی رکھی جا سکتی ہیں جن سے طلباء کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اس کے لئے مَیں ایک کمیٹی تجویز کر دوں گا جو دودھ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے غور کرے گی اور کوشش کرے گی کہ لوگوں کو سستا دودھ میسر آ سکے۔ اسی طرح اس کمیٹی کا یہ بھی کام ہو گا کہ لوگوں کو یہ تحریک کرے کہ وہ گھروں میں بھینسیں رکھیں تا قادیان کی یہ دِقّت دور ہو جائے۔

(3)

تیسری چیز جس کی طرف مَیں جماعت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ

ہماری جماعت کی طرف سے فوج میں ایک احمدیہ ڈبل کمپنی پہلے سے موجود ہے۔ مگر اب گورنمنٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک اَور احمدیہ ڈبل کمپنی قائم کی جائے اور اس کے لئے اس نے رنگروٹ مانگے ہیں۔ ناظر صاحب امورِ عامہ اس غرض کے لئے مختلف اضلاع کا دورہ کر رہے ہیں چنانچہ سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور گورداسپور کا دَورہ کرنا ان کے مدنظر ہے۔ بعض مقامات کا وہ دورہ کر چکے ہیں اور بعض جگہ وہ عنقریب دَورہ کے لئے پہنچنے والے ہیں۔ مَیں جماعت کے دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ انہیں اس بھرتی کے کام میں دلچسپی لینی چاہئے اور زیادہ سے زیادہ نوجوان اس غرض کے لئے پیش کرنے چاہئیں۔ میرے نزدیک اگر صرف گورداسپور کے ضلع کے لوگ ہی اپنی ذمہ داری کو سمجھیں تو تین ساڑھے تین سَو آدمی صرف یہیں سے بھرتی ہوسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے بہت سے رنگروٹ ہماری جماعت کی طرف سے جاچکے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو امن اور آرام اور نماز کی پابندی کی نعمت اور نیکی کی تحریک احمدیہ کمپنی میں میسر آسکتی ہے وہ کسی دوسری کمپنی میں میسر نہیں آسکتی۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کوئی جماعت زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے افراد فوجی فنون کے ماہر نہ ہوں۔ قوموں کے مرنے کی علامت یہی ہوا کرتی ہے کہ موت کا خوف ان کے دلوں میں بڑھ جاتا ہے اور قوموں کی زندگی کی علامت یہ ہوتی ہے کہ موت کا خوف ان کے دلوں سے جاتا رہے جو قومیں موت کا خوف اپنے دلوں میں بڑھا لیتی ہیں وہ کبھی فاتح نہیں ہوسکتیں اور جن قوموں کے دلوں میں سے موت کا خوف مٹ جاتا ہے۔ انہیں کوئی مفتوح نہیں کر سکتا۔ یہودیوں کو ہی دیکھ لو اب ان کی کہیں حکومت نہیں اور جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ وہ موت سے بے حد ڈرتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہزار سال تک زندہ رہے مگر فرماتا ہے اگر کوئی ہزار سال بھی زندہ رہا تو کیا ہے آخر ایک دن اس نے مرنا ہے اور جب سے کہ انسان پیدا کیا گیا ہے وہ موت کا شکار ہوتا چلا آیا ہے بلکہ جیسا کہ مَیں نے بارہا کہا ہے۔ موت بھی خدا تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔ اگر موت نہ ہو تو دنیا پر ایسا عذاب آجائے جو انسانی طاقتِ برداشت سے بالکل باہر ہو جائے۔ وہی ماں باپ جو اپنے بچوں سے پیار کرتے

اور بعض دفعہ ان پر جانیں دے دیتے ہیں اور وہی بچے جو اپنے ماں باپ سے محبت رکھتے بلکہ بعض دفعہ ان کے لئے جانیں دے دیتے ہیں۔ اگر موت نہ ہو تو ایک دوسرے کو کاٹ کاٹ کر کھانے کی کوشش کریں۔ تم اندازہ کرلو کہ آدم سے لے کر آج تک کے آدمی نہیں بلکہ صرف دو صدیوں کے آدمی ہی جمع ہو جائیں تو دنیا میں رہنے کے لئے کوئی جگہ نہ رہے۔ دنیا میں انسان کی اوسط عمر 30 سال ہے اور اگر دو صدیوں کے لوگ جمع ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ موجودہ آبادی سے سات گنا آبادی دنیا کی بڑھ جائے گی۔ اب سمجھ لو کہ اگر ایسا ہی ہو جائے تو وہ زمیندار جن کے پاس چار چار پانچ پانچ ایکڑ زمین ہے ان کے پاس صرف پانچ پانچ سات سات کنال رہ جائے اور جن کے پاس صرف پانچ پانچ چھ چھ کنال زمین ہے۔ ان کے پاس تو بارہ بارہ تیرہ تیرہ مرلہ زمین رہ جائے بلکہ یہ بھی مَیں نے غلط اندازہ لگایا ہے کیونکہ یہ صرف پیدا ہونے والے بچوں کا انداازہ لگایا گیا ہے۔ مُردہ پیدا ہونے والے بچوں یا اسقاط والے بچوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ اگر ان سب کو شامل کر لیا جائے تو جن کے پاس آج پانچ پانچ گھماؤں زمین ہے۔ ان کے پاس پونا پونا مرلہ رہ جائے اس سے اندازہ کر لو کہ اگر موت نہ ہو تو دنیا کی کیا حالت ہو جائے۔ مَیں تو سمجھتا ہوں وہ ماں باپ جو آج اپنے بچوں پر جانیں دیتے ہیں شاید موت نہ ہونے کی صورت میں ان کے گلے کاٹنے کو دوڑتے کہ یہ کمبخت مرتے بھی نہیں۔ اور وہی بچے جو اپنے ماں باپ پر جانیں فدا کرتے ہیں ماں باپ کو گالیاں دیتے کہ ہمارے لئے جگہ ہی خالی نہیں کرتے۔ ساری محبتیں اور سارے پیار موت کے نتیجہ میں ہیں۔ ماں باپ اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں تو ان کے پیار کے پیچھے موت کا خیال ہوتا ہے کہ ایک دن ہم مر جائیں گے اور یہ ہمارا نام قائم رکھیں گے۔ بچے اپنے ماں باپ سے محبت کرتے ہیں تو ان کی محبت کے پیچھے بھی موت کا خیال ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک دن آئے گا جب ہمارے ماں باپ مر جائیں گے اور ہم ان کو یاد کیا کریں گے۔ آؤ ہم اپنی زندگی میں ان کی کچھ خدمت کر لیں۔ لیکن اگر موت نہ ہوتی تو نہ بچوں کے دلوں میں اپنے ماں باپ کی محبت ہوتی نہ ماں باپ کے دلوں میں اپنی اولاد کی محبت ہوتی۔ سب ایک دوسرے کے دشمن ہوتے۔ تو موت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت اور اس کے فضلوں میں سے ایک بہت بڑا فضل ہے۔ موت اسی وقت

بُری معلوم ہوتی ہے جب اس کی ضرورت اور حاجت مٹ جائے اسی لئے خدا تعالیٰ نے جنت میں موت نہیں رکھی۔ کیونکہ جنت میں رزق دینا خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھا ہؤا ہے کسی انسان کے ذمہ نہیں کہ وہ دوسروں کو رزق دے۔ وہاں یہ سوال نہیں ہو گا کہ فلاں مر جائے تا کہ اس کا لقمہ میرے مُنہ میں پڑے بلکہ وہاں ہر ایک کے لئے خدا نے خود انتظام کیا ہؤا ہو گا۔ اس لئے وہاں باوجود موت نہ ہونے کے عداوت نہیں ہو گی بلکہ سب محبت اور پیار سے رہیں گے۔ تو جنت میں سے موت کو مٹا دینا اور دنیا میں موت کو رکھنا اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتوں میں سے ہے۔ دنیا میں چونکہ احتیاج ہے اس لئے ضروری تھا کہ یہاں موت ہو مگر جنت میں چونکہ احتیاج نہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہاں موت نہ ہو بلکہ جو لوگ دوزخ میں جائیں گے انہیں بھی کچھ عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نکال کر جنت میں لے آئے گا اور کسی کو بھی گھبراہٹ نہیں ہو گی کہ ان کے آنے سے ہمارے رزق میں کمی ہو جائے گی۔

تو موت ایسی چیز نہیں جس سے ہمارے دلوں میں کوئی گھبراہٹ پیدا ہو سکے۔ ہم سے پہلے لوگ مرتے چلے آئے، ہم مر جائیں گے اور ہمارے بعد آنے والے بھی مر جائیں گے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ایک شخص عزت کی موت مرتا ہے اور ایک شخص ذلت کی موت مرتا ہے جو شخص عزت کی موت مرتا ہے۔ اس کا نام دنیا میں بھی رہ جاتا ہے اور اگلے جہان میں بھی قائم رہتا ہے اور جو شخص ذلت کی موت مرتا ہے اس کا نام دنیا میں بھی مٹ جاتا ہے اور اگلے جہان میں بھی اس پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ لڑائیوں میں ہی دیکھ لو۔ قید وہی ہوتے ہیں جو عزت کی موت مرنا نہیں جانتے۔

جرمنوں کو دیکھو ہم ان کے افعال کو شدید نفرت سے دیکھتے ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہادر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے قیدی بہت کم پکڑے جاتے ہیں اس لئے کہ ہر لڑائی میں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم قید ہو گئے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہمارے دشمن کی فوج بڑھ گئی مثلاً اگر دس ہزار آدمی قید ہو جاتے ہیں تو یہ دس ہزار قیدی دوسروں کے کام آتے ہیں اور دشمن کے بالمقابل دس ہزار آدمی دوسری جگہوں پر حملہ کرنے کے لئے آزاد ہو جاتے ہیں۔ پس وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم قید ہو گئے تو اس کا دشمن کو فائدہ ہو گا اس کی دس ہزار فوج

بڑھ جائے گی لیکن اگر ہم دس ہزار مر گئے تو گو ہماری فوج سے دس ہزار کم ہو گا مگر ان کی فوج کے لئے بھی دس ہزار آدمیوں کو ہم مار ڈالیں گے۔ چنانچہ لیبیا کی پہلی لڑائی میں انگریزوں نے چالیس ہزار قیدی بنائے تھے جن میں سے صرف دس ہزار جرمن تھے اور تیس ہزار اٹالین۔ یہی حال روس کی جنگ کا ہے۔ وہاں بھی جرمن بہت کم قید ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم مر گئے تو ملک کو زیادہ فائدہ ہو گا بہ نسبت اس کے کہ ہم قیدی بن جائیں کیونکہ موت تو قید ہونے کی حالت میں بھی آسکتی ہے اور آزاد ہونے کی حالت میں بھی۔ ہزاروں ہزار واقعات دنیا میں ایسے ہوتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ انسان بڑے غرور اور تکبر سے سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے کو مار ڈالے گا مگر اچانک کوئی ایسا حادثہ ہو جاتا ہے کہ وہ خود ہلاک ہو جاتا ہے۔

حضرت نظام الدین صاحب اولیاء کے متعلق لکھا ہے کہ دلّی کے ایک بادشاہ کی ان سے رقابت ہو گئی۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ بعض لوگوں نے اس کے پاس شکایت کرنا شروع کر دی کہ بڑے بڑے لوگ آپ کے دربار میں کم آتے ہیں مگر نظام الدین صاحب اولیاء کے پاس بہت جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل میں رنج پیدا ہونا شروع ہو گیا اور آخر منصوبہ بازوں کی تحریک پر اس نے فیصلہ کیا کہ حضرت نظام الدین صاحب اولیاء کو قتل کر دیا جائے۔ درباریوں میں سے ان کے جو معتقد تھے وہ دوڑے دوڑے حضرت نظام الدین صاحب اولیاء کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ بادشاہ نے آپ کے قتل کا فیصلہ کیا ہے مگر کہا ہے کہ مَیں اب فلاں مہم پر جا رہا ہوں وہاں سے واپس آکر انہیں قتل کروں گا۔ انہوں نے کہا موت اور حیات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کسی بادشاہ کے اختیار میں نہیں۔ خیر وہ مہم پر گیا اور جب واپس آنے لگا تو آپ کے مریدوں میں بے چینی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انہوں نے کہا کہ ہمیں اجازت دیجئے۔ ہم بادشاہ کے امراء اور وزراء سے مل کر اس کی ناراضگی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے فرمایا ہنوز دلّی دور است۔ دو چار دن کے بعد پھر رپورٹیں پہنچیں کہ اب تو بادشاہ اَور زیادہ قریب آگیا ہے چنانچہ انہوں نے پھر حضرت نظام الدین صاحب اولیاء کی خدمت میں عرض کیا کہ بادشاہ تو اَور بھی قریب آگیا ہے۔ انہوں نے پھر یہی جواب دیا کہ ہنوز دلّی دور است۔ غرض ہر ہر منزل پر مریدوں کی بے چینی بڑھتی جاتی اور وہ بار بار عرض کرتے کہ حضور بادشاہ

تو اب اَور بھی دلّی کے قریب پہنچ گیا ہے۔ مگر وہ ہر بار یہی جواب دیتے کہ ہنوز دلّی دور است۔ آخر اطلاع ملی کہ بادشاہ دلّی کے باہر خیموں میں ٹھہرا ہوا ہے اور کل شہر میں داخل ہو گا۔ مریدوں نے پھر جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا کہ حضور اب تو اجازت دیں کہ مصالحت کی کوئی کوشش کی جائے مگر انہوں نے کہا ابھی فکر کی کیا بات ہے۔ ہنوز دلّی دور است۔ اس دن بادشاہ کے کامیاب آنے کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منایا گیا اور جیسا کہ پرانے زمانہ میں دستور تھا۔ امراء شہر کے باہر بھی محل بنوایا کرتے تھے۔ ولی عہد کا بھی شہر کے باہر ایک محل تھا۔ اس نے بادشاہ سے اپنی دعوت قبول کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کو منظور کر لیا اور چھت پر جشن کا انتظام کیا گیا۔ غالباً گرمی کا موسم ہو گا۔ بڑی کثرت سے امراء و رؤساء اس جشن میں شامل ہوئے اَور خوب ناچ گانا اور مجرا ہوا۔ ابھی یہ ناچ گانا ہو ہی رہا تھا کہ یکدم چھت گری اور بادشاہ اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا مقام ایک سچے مومن کا مقام تھا۔ انہوں نے خدا تعالیٰ پر توکل کیا اور وہ سمجھتے تھے کہ موت اور حیات خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر اس کی طرف سے مجھے موت آنی ہے تو مصالحت سے کیا بن جائے گا اور اگر موت نہیں آنی تو بادشاہ کیا اختیار رکھتا ہے کہ وہ مجھے موت کی سزا دے۔ اسی طرح اَور ہزاروں لوگ ہیں جو دوسروں کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتے ہیں اور مارنے کا ارادہ کرنے والے مر جاتے ہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ تدابیر کوئی چیز نہیں۔ تدبیریں بھی ضروری ہوتی ہیں مگر وہ عام حالات میں ہوتی ہیں جب عام عذاب آتا ہے تو خدا تعالیٰ موت اور حیات اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس وقت موت سے ڈرنا اول درجہ کی حماقت ہوتی ہے۔ صحابہؓ کو دیکھ لو۔ انہیں مارنے کے لئے دشمن نے کتنی کوششیں کیں قریباً تیس چالیس جنگیں ہوئیں مگر سوائے ایک دو جنگوں کے کہ جن میں چند مسلمان قید ہو گئے۔ کبھی مسلمان قید نہ ہوئے ورنہ کافر توبیسیوں کی تعداد میں قید ہوتے تھے مگر مسلمان ایک بھی قید نہیں ہوتا تھا اور ان کے قید نہ ہونے کے معنے یہی تھے کہ وہ اتنا لڑتے تھے کہ یا تو مارے جاتے تھے یا فتح حاصل کر لیتے تھے گویا موت سے نڈر رہنے کی وجہ سے وہ قیدی نہیں بنتے تھے اور یہی چیز ان کے غلبہ کا موجب بن گئی مگر کافر ہمیشہ قیدی بننے کو ترجیح دیتے اور جب بھی دیکھتے کہ ان کا پہلو لڑائی میں

کمزور ہو رہا ہے۔ وہ ہمت چھوڑ دیتے اور قیدی بن جاتے۔ رفتہ رفتہ یہی چیز ان کی تباہی کا موجب ہو گئی کیونکہ کچھ تو قید ہونے کی حالت میں ہی مسلمان ہو جاتے اور کچھ مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہو جاتے کہ ان کا مقابلہ کرنے کی روح کھو بیٹھتے۔ پس کافر قیدی یا تو مسلمان ہوتے جاتے تھے یا آجکل کی اصطلاح کے مطابق وہ مسلمانوں کا ففتھ کالم بن جایا کرتے تھے اَور اپنی قوم کو ڈرایا کرتے تھے کہ دیکھ مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرنا وہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ بالآخر اس کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیئے تھا کہ مسلمان کامیاب ہوگئے اور کفار ناکام ہوگئے۔

ہماری جماعت کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیوں کے مطابق ایک زمانہ آنے والا ہے۔ جب ہماری جماعت جو اس وقت سب سے زیادہ کمزور اور دنیا کے ظلم کا نشانہ بنی ہوئی ہے دنیا کی فاتح اور حکمران ہو گی اور دنیا کی سب قومیں۔ دنیا کی سب حکومتیں اور دنیا کی سب سلطنتیں اس کی تابع اور فرمانبردار ہوں گی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہماری جماعت ساری دنیا میں پھیل جائے گی اور دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں ایسی ہی جائیں گی جیسے چوہڑے اور چمار ہوتے ہیں۔ پس جب تک ہماری جماعت کے افراد کے اندر جرأت اور بہادری پیدا نہ ہو اور جب تک وہ فنونِ جنگ سے آشنا نہ ہوں وہ ایسے زمانہ میں کس طرح کام آسکتے ہیں۔ حکومت ہمارے پاس نہیں کہ اس کے زور سے ہم اپنی جماعت کے افراد کو ابھی سے یہ ٹریننگ دے سکیں۔ صرف یہی طریق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کا جو ذریعہ ہماری جماعت کے لئے نکالا ہے۔ اس سے ہماری جماعت کے دوست زیادہ سے فائدہ اٹھائیں۔ فوج میں داخل ہونے سے صرف ایک چیز کا خوف ہو سکتا ہے اور وہ موت ہے مگر جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے۔ موت ایک ایسی چیز ہے جو گھر پر بھی آجاتی ہے اور ایسے ایسے طریق پر آتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ایک شخص رات کو اچھا بھلا سوتا ہے مگر اچانک پچھلی رات اسے ہیضہ ہوتا ہے اور وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے فوت ہو جاتا ہے یا چھت گرتا ہے اور وہ اس کے نیچے دَب کر ہلاک ہو جاتا ہے یا پاؤں پھسل جاتا ہے اَور اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسے بیسیوں واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ پس موت سے ڈرنا جہالت کی بات ہے۔ مَیں تو سمجھتا

ہوں ہماری جماعت چونکہ فوجی فنون سے نا آشنا ہے۔ اس لئے اسے سب سے زیادہ فوجی کاموں میں حصہ لینا چاہئے تا کہ زیادہ سے زیادہ اس کے اندر جرأت اور دلیری پیدا ہو۔ ہمارے ملک میں سکھ بہت تھوڑے ہیں مگر عام طور پر لوگ ان سے ڈرتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ زیادہ تر فوج میں ملازم ہیں اور فوجی کاموں کی وجہ سے وہ نڈر ہو جاتے ہیں تو فوجی خدمت قوم کو بہادر بناتی اور اس کے افراد کے اندر جرأت اور بہادری پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح انتظام کی پابندی کی عادت بھی فوج میں داخل ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ کوئی فوجی کسی جگہ چوری کے لئے گیا جس گھر میں وہ چوری کرنے کے لئے داخل ہوا وہ آدمی ہوشیار تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ کوئی فوجی چوری کرنے کے لئے آیا ہے۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد یکدم اسے کہنے لگا۔ اٹن شن۔ اسے چونکہ پریڈ میں اٹنشن کے لفظ پر ساکت کھڑا ہونے کی عادت تھی اس لئے یہ سنتے ہی وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا اَور گھر والے نے اسے پکڑ لیا۔ یہ تو خیر لطیفہ ہے اصل سبق اس میں یہ دیا گیا ہے کہ فوجی زندگی نظام کی پابندی کا سخت عادی کر دیتی ہے۔ نوجوانوں میں عام طور پر آوارگی ہوتی ہے اگر وہ فوج میں چلے جائیں تو ان کی آوارگی بالکل دور ہو سکتی ہے۔ اسی طرح افسر کی بات نہ ماننے کی عادت بھی بعض نوجوانوں میں ہوتی ہے اَور اس نقص کا ازالہ بھی فوج میں ہو جاتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں خدام الاحمدیہ کا ایک جلسہ ہوا جس میں ایک شخص باتیں کرنے لگ گیا یا افسر نے خیال کیا کہ وہ بول رہا ہے۔ بہر حال خدام الاحمدیہ کے افسر نے اسے کہا کہ وہ کھڑا ہو جائے مگر اس نے کھڑا ہونے سے انکار کر دیا پھر وہ اسے میرے پاس لائے اور مَیں نے بھی اسے کہا کہ وہ سزا کو قبول کر لے مگر یہی کہتا رہا کہ میرا قصور کیا ہے؟ حالانکہ قصور ہو یا نہ ہو جب ایک افسر نے سزا دی ہے تو چاہے وہ غلط ہی ہو اطاعت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سزا کو قبول کیا جائے۔ انگریزی فوج کے متعلق کسی نے یہ لطیفہ لکھا ہے کہ کوئی افسر پریڈ کرا رہا تھا۔ اور اس کی اپنے کسی ماتحت سپاہی سے عداوت تھی۔ پریڈ کراتے کراتے اس نے کہا کہ سپاہی نمبر فلاں تمہارا قدم ٹھیک نہیں پڑتا مَیں تمہیں کوارٹر گارڈ میں بھیجتا ہوں۔ سپاہی نے کہا میرا قدم بالکل ٹھیک ہے۔ اس پر افسر کہنے لگا دیکھو سپاہی نمبر فلاں تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے مگر چونکہ تم

نے اپنے افسر کی بات کا جواب دیا ہے اس لئے پہلے جرم کی سزا میں نہیں بلکہ اس جرم کی سزا میں مَیں تمہیں قید خانے میں بھیجتا ہوں۔ اب بظاہر یہ ایک ہنسی کی بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا نظام بھی ایک دائرہ میں ضروری ہوتا ہے۔ اگر بحث کا دروازہ کھول دیا جائے اور ہر شخص کہے کہ جب تک فلاں بات مجھے سمجھا نہ دی جائے مَیں کوئی کام نہیں کر سکتا تو کیا ایسی صورت میں کوئی بھی کام ہو سکتا ہے۔ بے شک سمجھ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے مگر اس کے بعد سمجھ کا نہیں بلکہ اطاعت کا سوال ہوتا ہے اور انسان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بِلا چون وچرا ہر حکم کی تعمیل کرے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں خدا ہے یا نہیں۔ پھر اگر ثابت ہو جائے کہ خدا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم غور کریں آیا کوئی رسول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ پھر اگر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آجائے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی رسول ہو سکتا ہے تو ہمارا حق ہے کہ ہم مطالبہ کریں کہ جو شخص اس وقت رسالت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے یا نہیں مگر جب ہم اس کو خدا تعالیٰ کا رسول تسلیم کر لیں اور مان لیں کہ اسے خدا نے ہی دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔ تو پھر ہمارا یہ حق نہیں رہتا کہ ہم یہ کہیں کہ ہم نماز میں سینہ پر ہاتھ کیوں باندھیں اور رکوع میں کیوں جائیں اور سجدہ کیوں کریں۔ اگر ہم ایسا کہیں تو یہ حماقت ہو گی کیونکہ جہاں تک ہم عقل سے کام لے سکتے تھے ہم نے عقل سے کام لے لیا۔ اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم مانیں اور عمل کریں۔ اسی طرح احمدیت میں داخل ہونے سے پہلے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ کہے مَیں نہیں مانتا خدا کو، مَیں نہیں مانتا رسالت کو، مَیں نہیں مانتا محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو، مَیں نہیں مانتا مرزا غلام احمد صاحب کی صداقت کو۔ لیکن اگر کوئی شخص مان لیتا ہے خدا کو، مان لیتا ہے رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو، مان لیتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو، تو پھر اُسے حق نہیں رہتا کہ ان کے حکموں پر عمل کرنے سے پہلے ان کے سمجھ لینے پر اصرار کرے۔ بے شک ساتھ کے ساتھ سمجھنے کی بھی کوشش کرے مگر عمل حکم کے ساتھ ہی شروع کرنا ہو گا۔ البتہ وہ شخص کہہ سکتا ہے کہ مَیں مرزا غلام احمد صاحب کو تو مانتا ہوں مگر خلافت کو نہیں مانتا۔ جیسے پیغامی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو تو مانتے ہیں مگر خلافت کو نہیں مانتے۔ لیکن اگر وہ کسی وقت خلافت کو بھی تسلیم کر لیتا ہے تو پھر اس کا یہ حق بھی منسوخ ہو جائے گا اور اب اس کا یہی کام رہ

جائے گا کہ وہ خلافت کے احکام کو مانے، نہ یہ کہ اس کے حکموں پر اعتراض کرے اور کہے کہ جب تک میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئے گی، مَیں عمل نہیں کروں گا۔ پس عقل ہمیشہ ایک حد تک چلتی ہے اگر ہمیشہ کے لئے عقل کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو کام بالکل بند ہو جائیں۔ مَیں ایک دفعہ دھرمسالہ سے آ رہا تھا۔ ان دنوں انفلوئنزا کے حملہ کی وجہ سے میرا دل بار بار کمزور ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب میرے ساتھ تھے۔ اتفاقاً راہ میں بھی تکلیف ہو گئی۔ وہیں قریب ہی بڑا ہسپتال تھا۔ ضلع کے سول سرجن اس وقت ایک مسلمان تھے۔ ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب ہسپتال میں کوئی دوائی لینے کے لئے گئے تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئے اور کہنے لگے۔ سول سرجن صاحب کہتے ہیں آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے یہاں تشریف لے آئیں چنانچہ مَیں ان کے پاس گیا۔ وہ بڑی محبت سے پیش آئے اور کہنے لگے مجھے آپ کی ملاقات کا عرصہ سے اشتیاق تھا۔ اب جو پتہ لگا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو مَیں نے مناسب سمجھا کہ آپ کی ملاقات کر لوں۔ پھر کہنے لگے مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو آپ کے لئے نسخہ بتا دیا ہے اور اس میں صرف تین چیزیں پڑتی ہیں۔ نکس وامیکا، سوڈا بائیکارب اور ایک اَور دوا بتائی جو اس وقت مجھے یاد نہیں رہی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے یہ نسخہ جو ہے اس کے متعلق میرا بیس سالہ تجربہ یہ ہے کہ نکس وامیکا اگر اتنے ہی قطرے ڈالیں جتنے مَیں نے لکھے ہیں، اسی طرح سوڈا بائیکارب اتنے گرین ہی ڈالیں جتنے مَیں نے لکھے ہیں، اسی طرح تیسری دوائی بھی جس مقدار میں مَیں نے لکھی ہے اسی مقدار میں ملائی جائے تب تو یقینی فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ذرا بھی ان میں کمی بیشی کر دی جائے تو فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ کیوں! تو مَیں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا مگر میرا بیس سالہ تجربہ یہی ہے کہ اس نسخہ میں تبدیلی کرنے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ فائدہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب دوائیں مقررہ اوزان میں ڈالی جائیں۔

تو بیسیوں چیزیں دنیا میں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہوتی ہے اور بیسیوں چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے۔ مگر عقل میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص کی بات مانی جائے تو دنیا میں کبھی کوئی کام ہو ہی نہ سکے۔ فرض کرو لڑائی ہو رہی ہو اور دشمن شمال

سے بھی حملہ کر رہا ہو، جنوب سے بھی حملہ کر رہا ہو، مشرق سے بھی حملہ کر رہا ہو اور مغرب سے بھی حملہ کر رہا ہو۔ ایسی حالت میں افسر سمجھتا ہے کہ اگر جنوب کے حملے کو روک دیا جائے تو سب حملے رک جائیں گے مگر ایک ماتحت یہ کہتا ہے کہ اگر شمال کے حملے کو روکا جائے تب فائدہ ہوگا اَور ایک سپاہی بولتا ہے اور کہتا ہے پہلے مشرق کے حملے کا دفاع کرنا چاہئے اور کچھ کہہ اٹھتے ہیں کہ مغرب کی طرف پہلے بڑھنا چاہئے۔ اب اگر یہی قانون ہو کہ جو بات کسی کے ذہن میں آئے اس پر عمل کرلے تو کچھ سپاہی مشرق کو چلے جائیں گے، کچھ مغرب کو، کچھ شمال کو اور کچھ جنوب کو اور سب کو دشمن ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ پس وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ زید یا بکر کی عقل میں کیا آتا ہے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ جو افسر کہتا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ پھر اس بات کی کون ذمہ داری لے سکتا ہے کہ جو بات وہ کہتا ہے وہ تو درست ہے مگر جو رائے اس کے افسر کی ہے وہ غلط ہے۔ تو نظام لوگوں سے خیالات کی قربانی کا سب سے زیادہ مطالبہ کیا کرتا ہے۔ پیغامی اس کا نام پیر پرستی رکھتے ہیں حالانکہ یہ پیر پرستی نہیں۔ ہم تو کہتے ہیں جن باتوں کے کرنے کا تمہیں خدا نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرو۔ پھر ہم کہتے ہیں جن باتوں کے کرنے کا تمہیں رسول کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرو۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمہیں جو احکام دئے ہیں ان کو مانو اور پھر جو باتیں رہ جائیں ان میں خلیفہ اور جماعت کے دوسرے افسروں کی اطاعت کرو۔ پس یہ پیر پرستی کیسے ہوگئی۔ پیر پرستی تو تب ہوتی جب ہم کہتے کہ تم خدا کی نہ مانو، رسول کی نہ مانو۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی نہ مانو، صرف ہماری مانو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو بے شک یہ پیر پرستی ہوتی۔ مگر ہم تو کہتے ہیں تم خدا کی مانو، خدا کے رسول کی مانو، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مانو اور پھر جو باتیں رہ جائیں۔ ان میں ہمارے احکام مانو اور جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے اس کے بغیر دنیا میں کبھی کوئی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ گھر میں میاں بیوی میں بھی بعض دفعہ اختلاف ہو جاتا ہے اور میاں کی کچھ مرضی ہوتی ہے اور بیوی کی کچھ۔ مگر پھر بھی ایک اصول کے ماتحت ان تمام اختلافات کو طے کیا جاتا ہے یعنی گھر کے اندرونی معاملات میں ماں کی بات مانی جاتی ہے اور بیرونی معاملات میں باپ کی بات مانی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر گھر میں روزانہ سر پھٹول ہوتی رہے۔ باپ کہے کدو پکانا ہے،

ماں کہے شلغم پکانا ہے، بہن کہے دال پکانی ہے اور بھائی کہے کہ بینگن پکانا ہے۔ اب سارے بیٹھے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ مَیں کدو کھاؤں گا، دوسرا کہتا ہے کہ مَیں شلغم کھاؤں گا، تیسرا کہتا ہے کہ مَیں دال کھاؤں گا اور چوتھا کہتا ہے کہ مَیں بینگن کھاؤں گا۔ یا یہ صورت ہوگی کہ ہر ایک نے الگ الگ ہنڈیا چڑھائی ہوئی ہوگی۔ ایک نے کدو چڑھایا ہوا ہوگا۔ ایک نے شلغم چڑھائے ہوئے ہوں گے۔ ایک نے دال چڑھائی ہوئی ہوگی۔ ایک نے بینگن چڑھائے ہوئے ہوں گے۔ اس طرح گھی الگ ضائع ہو رہا ہوگا۔ ایندھن الگ جل رہا ہوگا اور محنت الگ خرچ ہو رہی ہوگی۔ تو یہ بھلا عقل کی بات ہے کہ جس کے جی میں جو بات آئے وہ اُسے منوانا شروع کر دے۔ اگر اس بات کی اجازت دی جائے تو لڑکے اور لڑکیاں روزانہ ماؤں کو دق کرنا شروع کر دیں۔ لڑکے کہیں کدو کیوں نہیں پکایا اور لڑکیاں کہیں بینگن کیوں نہیں پکایا۔ ماں صرف ایک ہی بات جانتی ہے کہ جو میرے جی میں آئے گا، پکاؤں گی۔ جب مَیں مَر جاؤں گی تو بے شک اپنی مرضی کے مطابق پکا لینا۔ اگر روزانہ بحثیں ہوتی رہیں تو وہ کبھی ختم ہی نہ ہوں۔

تو ایسے معاملات میں نظام کی پابندی کی عادت ہی قوم کو زندہ رکھتی ہے اور نظام کی پابندی کی عادت بہت حد تک فوج میں پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے یہ جنگ اس قسم کی ہے کہ اسلام اور احمدیت پر اس کا بڑا بھاری اثر پڑنے والا ہے۔ اس لئے اسلام اور احمدیت پر اس جنگ کا جو بھی اثر ہو۔ اس کو مٹانے کا ذریعہ یہ ہے کہ ہماری جماعت کے لوگ زیادہ سے زیادہ فوج میں داخل ہوں تا کہ ان بد اثرات کو مٹا سکیں اور اگر اُن بد اثرات کو نہ مٹا سکیں۔ تو کم سے کم وقت پر اپنی جماعت کی حفاظت تو کر سکیں۔ اگر آج وہ فوجی فنون نہیں سیکھیں گے تو کل وہ ان برکات کو بھی حاصل نہیں کر سکیں گے جو فاتح قوموں کے لئے مقدر ہوتی ہیں۔ مَیں اس امر کی طرف خصوصیت سے زمیندار دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں۔ شروع شروع میں زمینداروں نے جماعتی کاموں میں اچھا حصہ لیا تھا مگر اب سالہا سال سے شہریوں نے جماعت کا کثیر بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔ پس اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت کے لئے ایک ترقی کا راستہ کھولا ہے۔ زمیندار دوستوں کو خصوصاً اس ذریعہ سے اپنے ثواب کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایسے موقع پر جی چرانا خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے کا موجب بن جاتا

ہے اَور جس جان کو بچانے کی انسان کوشش کرتا ہے وہ کسی اَور طرح ضائع ہو جاتی ہے۔ اب اس وقت دو ہی ذریعے ہیں کہ یا تو ہمارے آدمی جائیں اور دشمن کو سرحد پر ہی روک لیں یا دشمن ہمارے گھروں پر آجائے اور وہ یہاں سب کو مار ڈالے۔ ان دونوں میں سے کونسا طریق بہتر ہے۔ یہ بہتر ہے کہ ہمارے آدمی سرحد پر جائیں اور ان میں سے کچھ مارے جائیں اور باقی دشمن کے حملہ کو روک دیں یا یہ بہتر ہے کہ وہ ہندوستان میں آجائے اور یہاں کے لوگوں کو آکر ہلاک کرنا شروع کر دے۔

حضرت خلیفہ اول کا یہ واقعہ نہایت ہی دردناک اور عبرت آموز ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب روس اور ترکی کی لڑائی ہوئی تو میرے دل میں مسلمانوں کی خدمت کا جوش پیدا ہوا۔ ہم اس وقت پانچ بھائی تھے اور پانچوں نوجوان تھے۔ مَیں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ بیٹے دیئے ہیں۔ آپ اپنا ایک بیٹا اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیں اور مجھے اجازت دیں کہ مَیں ترکوں کے علاقہ میں جاکر فوج میں بھرتی ہو جاؤں اور روسیوں سے لڑوں۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ نے اس بات کے جواب میں ایک بڑی آہ بھری اور کہا پانچ بیٹے ہوں یا سات کیا کوئی ماں اپنے ہاتھ سے بھی اپنا بچہ قربان کرنے کے لئے تیار ہو سکتی ہے؟ مَیں نے کہا۔ امّاں! اللہ میاں کا حکم ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ اس لئے مَیں جاتا تو نہیں مگر مجھے ڈر ہے کہ آپ کے اس فعل کے نتیجہ میں آپ کے بیٹے آپ کی آنکھوں کے سامنے وفات پا جائیں گے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے ابھی ہماری ماں زندہ ہی تھیں کہ میرے چاروں نوجوان بھائی وفات پا گئے۔ جب میرا چوتھا بھائی فوت ہوا تو مَیں اپنی ماں کے پاس گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ بے قراری کے ساتھ مجھ سے چمٹ گئیں اور کہنے لگیں وہ ماں کیوں نہ روئے جس کے چار نوجوان بیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے وفات پا گئے۔ مَیں نے کہا ماں! آپ نے اب بھی بے صبری سے کام لیا ہے۔ اس لئے مَیں ڈرتا ہوں کہ جب آپ مریں گی تو اُس وقت مَیں بھی موجود نہیں ہوں گا۔ چنانچہ ہم جموں میں تھے کہ ہماری والدہ بعد میں بیمار ہو کر فوت ہو گئیں۔ تو موت اور حیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جو قومیں زندگی اور بیداری رکھتی ہیں وہ موت کو خوشی سے قبول کرتی ہیں اور جو قومیں موت سے

ڈرتی ہیں اور اپنے بچوں کی جانوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بچے دوسرے ذرائع سے ان کے سامنے مار ڈالتا ہے۔ پس مَیں جماعت کے دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں خصوصاً ان اضلاع کی جماعتوں کو جن کا ناظر صاحب امور عامہ دورہ کر رہے ہیں کہ وہ ہمت اور کوشش کر کے نوجوانوں کو بھرتی کرائیں اور انہیں اس دن کے لئے تیار کریں جس دن احمدیت ان سے قربانی کا مطالبہ کرے گی۔ اگر آج وہ تیار نہیں ہوں گے تو وہ وقت پر کچّے دھاگے ثابت ہوں گے اور اسلام اور احمدیت کے لئے قربانی نہیں کر سکیں گے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر فوج میں بھرتی ہوئے تو جرمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ فوج میں بھرتی نہ ہوئے تو کیا جرمن اسی جگہ نہیں آجائیں گے۔ اس صورت میں تو وہ اسی جگہ جرمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے اور یہ ایک ذلت کی موت ہوگی جس سے انہیں بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ پھر مَیں کہتا ہوں مومن تو وہ ہوتا ہے جو سوائے خدا کے کسی سے ڈرتا ہی نہیں۔ آج وہ جرمن سے ڈر گئے ہیں، کل جاپان سے ڈر جائیں گے، پرسوں کسی اَور قوم سے خوف کھاتے پھریں گے۔ پھر وہ فتح کس پر حاصل کریں گے حالانکہ مومن تو وہ ہوتا ہے جو کسی کی پرواہ ہی نہیں کرتا اور وہ سمجھتا ہے کہ میرے مقابلہ میں کوئی دشمن نہیں ٹھہر سکتا۔ جس مومن کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے وہ مقابلہ کے وقت سب پر بھاری ہوتا ہے۔

ہم نے ایک دفعہ بچپن میں دیکھا کہ ایک جگہ کچھ احمدی مزدور کام کر رہے تھے کہ دس پندرہ سکھ ہاتھوں میں ڈنڈے اَور لاٹھیاں لئے ہوئے ان پر حملہ کرنے کے لئے آ گئے۔ ایک مخلص احمدی اکیلا ہی ان سکھوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ بعض نے کہا بھی کہ آپ اکیلے ہیں نہ جائیں مگر اس نے کہا کہ کوئی پرواہ نہیں اور اس ایک احمدی کے مقابلہ میں وہ دس پندرہ سکھ اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے بے اختیار ہنسنے لگ گئے۔ اسی طرح یہاں ایک دفعہ ایک زمین کا معاملہ تھا وہ قانوناً ہماری تھی مگر بعض سکھ کہہ رہے تھے کہ ہماری ہے۔ میر امتیاز میرے پاس آیا اور اس نے مجھے حالات سے اطلاع دی۔ مَیں نے اسے کہا کہ بعض آدمی اپنے ساتھ لے جاؤ اور زمین میں ہل چلا دو۔ اگر وہ مقدمہ کرنا چاہتے ہیں تو بے شک مقدمہ کر

دیں۔ جو آدمی مَیں نے بھجوائے تھے ان سے اقرار لے لیا گیا تھا کہ وہ وہاں لڑائی نہیں کریں گے مگر خدا تعالیٰ کی قدرت سے جب وہ چلے گئے تو بعد میں کسی نے مشہور کر دیا کہ وہاں احمدی گئے ہیں ان کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں بغیر میری اطلاع کے سو دو سو احمدی وہاں پہنچ گئے۔ ادھر سے سکھ وغیرہ بھی اکٹھے ہو گئے۔ جو لوگ میری طرف سے مقرر تھے۔ انہوں نے ہماری جماعت کے دوستوں کو روک دیا کہ تم اس میں کچھ دخل نہ دو مگر جب ان میں سے ایک ہل چلانے لگا تو سکھوں میں سے کسی نے چاقو کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا بچانے کے لئے نو آمدہ لوگوں میں سے ایک دو شخص آگے بڑھے ان میں سے ایک نے اس سکھ سے چاقو چھیننے کی کوشش کی۔ سکھوں نے اسے مارا۔ یہ دیکھ کر ایک دو لڑکوں نے جو اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے ان کا سامنا کیا۔ مگر باوجود اس کے کہ سکھ تیس چالیس کے قریب تھے اور حملہ کرنے والے صرف دو تین سکول کے لڑکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ بھاگ نکلے۔ مولوی سید سرور شاہ صاحب سناتے ہیں کہ جب مَیں نے یہ سنا کہ سکول کے لڑکے بھی اس طرف چلے گئے ہیں تو مَیں ڈرا کہ کہیں لڑکے کسی لڑائی میں ملوث نہ ہو جائیں۔ چنانچہ مَیں اس طرف جا رہا تھا کہ آگے سے ایک سکھ جو چھ ساڑھے چھ فٹ لمبا تھا۔ بے تحاشا دوڑتا ہوا آیا اور میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا مَیں لڑائی میں شامل نہیں تھا۔ خدا کے لئے مجھے بچایئے۔ وہ کہتے ہیں مَیں حیران ہوا کہ اسے کس سے بچاؤں آخر پیچھے جو دیکھا تو بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا درخت کی ایک شاخ ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے پیچھے دوڑا آ رہا تھا اور وہ سکھ یہ شور مچاتا جا رہا تھا کہ مولوی صاحب مجھے بچا لیں۔

تو مومن کے جوش کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی اور میرے نزدیک تو وہ مومن ہی نہیں ہو سکتا جو یہ سمجھے کہ جاپانی یا جرمن زیادہ بہادر ہیں۔ مَیں تو ایک منٹ کے لئے بھی ایسے شخص کو احمدی نہیں سمجھ سکتا جو کسی جرمن یا جاپانی کو اپنے سے زیادہ بہادر سمجھتا ہو۔ مومن کے تو معنے ہی یہی ہیں کہ وہ ہر غیر مومن سے اپنے آپ کو زیادہ بہادر سمجھے۔ قرآن کریم نے سچے مومن کی شناخت کا معیار یہی بیان فرمایا ہے کہ ایک ایک مومن دس دس دشمنوں پر بھاری ہوتا ہے۔[2] قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ ایک ایک مومن دس دس

پر بھاری ہوتا ہے۔ بشر طیکہ وہ جرمن یا جاپانی نہ ہوں بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہر سچا مومن دس پر بھاری ہوتا ہے تو اس میں جرمن بھی شامل تھے اور جاپانی بھی شامل تھے۔ پس جب تک ہر احمدی اپنے آپ کو دس دس غیر احمدی جاپانیوں اور دس دس غیر احمدی جرمنوں سے زیادہ بہادر، زیادہ دلیر اور زیادہ جری نہ سمجھے اس وقت تک وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچا مومن نہیں قرار پا سکتا بلکہ تورات میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر تم سچے دل سے ایمان لاؤ تو تمہارے بیس آدمی دشمن کے دو ہزار آدمیوں پر غالب آجائیں گے اور صحابہؓ نے اپنے عمل سے ایسا ہی کر کے دکھایا ہے۔ ایک دفعہ ساٹھ صحابہؓ نے کفار کے ساٹھ ہزار لشکر پر حملہ کیا۔ اور اس کے بڑے بڑے افسروں کو مار دیا۔ تو ایمان کے معنے یہی ہیں کہ تمہارے دلوں میں ایسی قوت اور بہادری ہو کہ تم کسی سے بھی نہ ڈرو۔ مَیں تو جب اپنی جماعت کے بعض دوستوں سے سنتا ہوں کہ جرمن بڑے بہادر ہیں یا جاپانی بڑے دلیر ہیں۔ تو مَیں سمجھتا ہوں اب ضرور جرمنوں اور جاپانیوں کا مقابلہ کرنا چاہئے کیونکہ اب ان کا مقابلہ کرنا ایک لحاظ سے دین کا حصہ ہے۔ میرے نزدیک ایسے احمدی ایمان میں بڑے کمزور اور کچے ہیں۔ ان کی تو یہ ہمت ہونی چاہئے کہ اگر ساری دنیا سے بھی جنگ ہو جائے تو وہی غالب آئیں گے کُجا یہ کہ جرمنوں اور جاپانیوں سے ڈرتے پھریں۔ ہمیں خدا نے اس حکومت سے جنگ کرنے سے منع کیا ہوا ہے جس کے ماتحت ہم رہتے ہوں لیکن اگر خدا کا حکم ہوتا تو کیا تم سمجھتے ہو ہم انگریزوں سے جنگ نہ کرتے؟ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو ہم میں سے ہر شخص اسی طرح حملہ کرتا جس طرح چیل چڑیا پر حملہ کرتی ہے اور اس یقین کے ساتھ حملہ کرتا کہ ہم غالب آئیں گے اور یہ مغلوب ہوں گے۔ تو ہمارا امن سے رہنا خدائی حکم کے ماتحت ہے ورنہ موت سے مومن نہیں ڈرا کرتا۔

پس مَیں دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ ان میں سے جو لوگ بھرتی کے قابل ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھرتی کے لئے پیش کریں۔ ہر شخص بھرتی کے قابل نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ نے اس کے لئے صحت کا ایک معیار مقرر کیا ہوا ہے جو دوست اس معیار پر پورے اترتے ہوں انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھرتی ہونا چاہئے تا کہ زیادہ سے زیادہ نوجوان فنون جنگ سے آشنا ہو سکیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ کب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آنے والی ہے کہ اپنا سب

کچھ قربان کر کے خدا تعالیٰ کے دین کے لئے نکل کھڑے ہوں اور یہ کام آسان نہیں بلکہ لڑائی سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ لڑائی میں توپیں اور تلواریں ساتھ جاتی ہیں مگر اس لڑائی میں نہ توپ ساتھ ہوتی ہے، نہ تلوار ساتھ ہوتی ہے۔ پس کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ایمان کی آزمائش کا موقع کب آنے والا ہے۔ یہ آزمائشیں جو اس وقت ہو رہی ہیں یہ تو بالکل ابتدائی ہیں اور ایسی ہی ہیں جیسے معمار اپنی ہتھوڑی سے اینٹ کے کنارے صاف کرتا ہے۔ اینٹ کے کنارے صاف کرنا اس کا اصل کام نہیں ہوتا بلکہ اصل کام وہ ہوتا ہے جب اینٹ دیوار میں لگ جاتی ہے۔ اسی طرح ابھی تو ہمارے کنارے صاف کئے جا رہے ہیں۔ پھر وہ وقت آئے گا جب ان اینٹوں کو دیوار میں لگا دیا جائے گا اور سارا بوجھ ان اینٹوں پر آ پڑے گا۔ اسی طرح جماعت کے جو کارکن ہیں ان کو بھی مَیں توجہ دلاتا ہوں کہ ان میں ایسے دوست اپنے نام مجھے یا دفتر امور عامہ میں لکھ کر بھجوا دیں۔ جو اپنے اپنے علاقوں میں اس غرض کے لئے دورہ کرنے اور نوجوانوں کو بھرتی پر آمادہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہمارے خاندان میں سے ایک بچہ، فوج میں گیا ہوا ہے۔ باقی بچے اس قابل نہیں۔ کسی کی آنکھیں کمزور ہیں اور کسی کی عمر نہیں۔ ہمارے ایک اَور بچے نے تین دفعہ بھرتی ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے اس غرض کے لئے اپنی پڑھائی بھی چھوڑ دی تھی مگر کامیابی نہ ہوئی تو ہمارے خاندان نے اپنا نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم نے اپنے بچے چھپا کر رکھے ہوئے ہوں۔ ایک بچہ فوج میں گیا ہوا ہے اور دوسرے نے پوری کوشش کی مگر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ غرض اللہ تعالیٰ کے فضلوں پر یقین رکھتے ہوئے آئندہ سلسلہ کی خدمات کے لئے تیار کرنے اور اس وقت جنگی خدمات میں حصہ لینے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہماری جماعت کے نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے آپ کو بھرتی کے لئے پیش کریں۔ اسی طرح مجھے یا ناظر صاحب امور عامہ کو وہ دوست اپنے اپنے نام بھجوا دیں جو اپنے علاقوں میں اس غرض کے لئے دورہ کرنے کو تیار ہوں۔ ایسے دوستوں کو چاہیئے کہ وہ گاؤں گاؤں میں پھر کر نوجوانوں کو تلقین کریں اور ان میں سے جو قابل ہوں انہیں فوج میں بھرتی کرائیں۔

مَیں نے جیسا کہ کہا ہے ایک دفعہ پھر اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ موت کا ڈر

کسی زندہ قوم کے افراد کے دل میں نہیں ہو سکتا اگر خدانخواستہ تمہارے دلوں میں موت کا ڈر ہے یا جاپانیوں کا ڈر ہے یا جرمنوں کا ڈر ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارے دل کا اتنا حصہ ایمان سے خالی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں صاف طور پر فرماتا ہے اِیَّایَ فَارۡھَبُوۡنِ[3] کہ مجھ سے ہی ڈرو۔ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے تین دفعہ اس بات پر زور دیا ہے کہ صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہئے کسی اَور سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ چنانچہ اِیَّایَ سے پہلے فعل محذوف ہے۔ جو اِرۡھَبُوۡا ہے یعنی اِرۡھَبُوۡا اِیَّایَ۔ اس کے بعد ایک اَور امر محذوف ہے جس پر نا کا حرف دلالت کرتا ہے اور وہ فعل بھی اِرۡھَبُوۡا یا تَرۡھَبُوۡا ہے۔ تیسری بار فَارۡھَبُوۡنِ کہہ کر پھر تاکید کی گئی ہے۔ گویا اس فقرہ کو اگر پھیلایا جائے تو یوں بنے گا کہ اِرۡھَبُوۡا اِیَّایَ۔اِرۡھَبُوۡا فَارۡھَبُوۡنِ۔ یعنی مجھ سے ڈرو۔ ڈرو مجھ سے ہی ڈرو۔ یعنی سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ یہی مومن کی علامت ہے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے سوا کسی اَور سے نہیں ڈرتا اُس کو کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جب کسی قوم کے دل سے ڈر نکل جائے تو وہ قوم یا تو مر جائے گی یا فاتح ہو کر زندگی بسر کرے گی غلام کی زندگی نہیں بسر کر سکے گی۔ پس اپنے دلوں سے موت کا ڈر نکال دو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو۔ پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی تم کو مغلوب نہیں کر سکے گی ہاں اگر تم سچے احمدی نہیں تو تم کتّوں سے بھی ڈر سکتے ہو، بلیوں سے بھی ڈر سکتے ہو، چوہوں سے بھی ڈر سکتے ہو اور پھر اگر تمہارا ناقص ایمان ہے تو تمہیں سب سے زیادہ اپنے نفس سے ڈرنا چاہئے کیونکہ تمہارا نفس تمہیں جہنم میں لے جا سکتا ہے لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگ جاؤ تو پھر تمہیں نہ نفس سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی اَور چیز سے۔ خدا تعالیٰ کا ڈر تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ اور یاد رکھو کہ جہاں دنیا سے ڈرنا بزدلی کی علامت ہے وہاں خدا تعالیٰ سے ڈرنا بزدلی نہیں بلکہ جو لوگ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں وہ سب سے زیادہ بہادر اور دلیر ہوتے ہیں۔"

(الفضل 9 جولائی 1942ء)

1: کنگنی: ادنیٰ درجے کی جنس جس کے دانے نہایت باریک ہوتے ہیں

2: اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ (الانفال: 66)

3: البقرۃ: 41